

## ہن بادل وار برس ڈھولا.....عالیہ حرا

”اس قدر مصروفیت.....استغفر اللہ.....کچھ اسے اپنے ہونے کا احساس دو.....اسے سمجھاؤ کہ تم پر بھی تمہارا حق ہے وہ بھی۔“ توقیر نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے تفصیلی تبصرہ کیا۔

”روپ ورنگ پھیکا پڑ جائے گا۔ کوئی پوچھے گا بھی نہیں نظر بھر دیکھنا تو دور کی بات ہے ساری عمر کیا تنہا زندگی گزارے گی۔“

”اللہ نہ کرے تو قیر۔“ بڑی آپی نے برامانے والے انداز میں اسے دیکھا۔

”بس آپ مجھے ہی سمجھائیں۔ اسے کچھ نہ کہیں۔“ شاکی انداز میں اسے دیکھا۔

”وہ قائد اعظم کے قول پر عمل کرتی ہے کام.....کام.....اور صرف کام۔“ اس کی بے بسی سے ہٹا کر دوسری لگائی۔ پیپر ذرا دور کر کے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے رواں تبصرہ کیا۔ صائمین نے۔

”تم لوگوں کی طرح سست تو نہیں ہے ناں۔“ خفگی سے انہیں دیکھا۔

”خود بھی کچھ نہ کرنا اور دوسرا کرے تو بس روک ٹوک ہی کرتے رہنا۔“

”ارے میں کرتا تو ہوں نا کہیں ٹیوٹیوں کی جاب اور کیا کروں۔ باقی وقت کے لیے ذہنی اور جسمانی ریست نہ کروں تاکہ اگلے دن فریش رہوں۔“ توقیر نے بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

”صائمین ایک کپ چائے تو بنا لاؤ۔“

”یہ چائے کا کون سا وقت ہے؟“

”چائے کا وقت نہیں.....ضرورت ہوتی ہے جب طلب جاگ جائے تو رسد خود بخود ہی پیدا ہو جائے گی۔“

”فارغ نہیں ہوں میں۔“

”اچھا مستقبل کی مصورہ۔ دعائیں لیا کرو۔ کام بن جائے گا۔ جاؤ شاباش۔“

”شکریہ..... یاد رکھیں لے کر گئے تھے مائش کے گھر۔“ ٹکا سا جواب تھا۔

”تو تمہیں کیا کرنا ہے خارش کے گھر جا کر۔ مسکرا کر چھیڑا۔

صائمین نے تکیے ابرو سے دیکھا اور آپی نے مسکرا کر۔

”ڈویل شروع ہوا چاہتا تھا۔“ اسی وقت فریڑے اٹھا کر اندر آگئی۔

”واہ.....کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔“ بازو پھیلا کر خوشگوار سی سے دیکھا۔

”خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں.....میں اپنے لیے بنا رہی تھی تو آپی کے لیے بھی بنائی۔ پھر تم دونوں کا خیال آیا کہ اپنے نہیں دو لگے تو بنائی۔“ شرارتی انداز میں کہتے ہوئے مگ آپی کی جانب بڑھایا۔

”آئی نہیں سب اس ابھی تک۔“ توقیر نے اپنا کپ اٹھا لیا۔

”آج تو لیٹ آئے گی۔“ آپی نے پھر کہا۔

”لیٹ.....توقیر نے گھڑی کی جانب نگاہ کی۔“ اور کنٹالیمٹ ہوگی چھنچ رہے ہیں۔“

”ہاں.....نوبے تک آئے گی۔“ آپی نے اطلاع دی۔

”نوبے.....صائمین اور فریڈا چونکی۔

”کونسل بن گئی ہیں ایک بوڑھی خاتون کی۔“ ان کی لاعلمی میں معلومات کا اضافہ کیا۔

”ہیں.....انہوں نے آپی کی جانب دیکھا۔

”تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ اگر وہ اپنے وقت کا بہتر استعمال کر رہی ہے۔ ضروریات زندگی کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے پھر اس کی تعلیم کا خرچہ.....اس کی شادی جینز۔“ آپی نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

”اور اس بات کا احساس اسے خود بھی ہے کہ اس کے نایا سفید پوش آدمی ہیں۔ انہوں نے ابھی اپنی دو بیٹیوں اور دو بیٹے بیاہے ہیں اور ان کے پاس قارون کا خزانہ نہیں ہے اور نہ ہی چچا قارون کا خزانہ چھوڑ کر گزر رہے ہیں۔ اریبہ حقیقت پسند لڑکی ہے وہ اس بات کو سمجھتی ہے اور میں صاف کو۔ آپی! صبح اسکول دوپہر کو ٹیوشن۔ اب یہ جاب.....رات کو اخبار کے لیے لکھتی بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ماسٹر بھی مکمل کر رہی ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے اسے؟“ صائمین نے تاسف سے اپنی آپی کو دیکھا۔ اسے آج ہی پتہ چلا تھا۔

”آپ نے اسے سمجھایا نہیں؟“ فروانے دھیرے سے کہا۔

”کیا سمجھاؤں سب کچھ اسے بھی نظر آ رہا ہے۔ مہنگائی اس قدر ہے اور ضروریات زندگی کی محتاج.....اب اور کیا ہو سکتا ہے۔“

”آپ کی لہجہ اور انداز بتا رہے تھے کہ وہ اس بات کے حق میں ہیں کہ اریبہ مزید جاب کرے اور ان کے حق میں ہونے کا مطلب تھا کہ اب بھی راضی ہیں اور امی تو تھیں ہی اس کے کماؤ کے حق میں۔

”اور پھر کون سا ہمارے لیے کر رہی ہے۔ امی کے ہاتھ میں دیتی کیا ہے محض چند سو.....مہنگائی کس قدر ہے۔“

”اچھا میں چلوں.....“ گفتگو کو لایسنی جانتا ہوا توقیر کھڑا ہو گیا۔

”کیا مطلب.....بیٹھو ناں ابو سے مل کر جانا۔“ آپی نے اسے دیکھا۔

”نہیں نایا ابو سے تو ملاقات ہوتی رہتی ہے اور آج آپ سے بھی ملاقات ہوگئی۔“ کھڑے ہو کر جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور پھر ہاتھ باہر نکال کر انہیں خدا حافظ کہتا باہر نکل گیا۔ زیادتی تو ان کی جانب سے بھی ہو رہی تھی۔ عظمت درانی اریبہ کے بھی تو چچا تھا۔ ان لوگوں نے کیا حق ادا کیا۔

آج ویک اینڈ تھا۔ توقیر کو امید تھی کہ اریبہ آج گھر پر مل جائے گی تو لٹچ کے بعد ملک ہاؤس میں آگیا۔

”ویک اینڈ اور تم اور یہاں.....“ فروانے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”میرے چچا کا گھر ہے اعتراض ہے کیا؟ چلو جلدی سے چائے لاؤ۔ صبحی ہے گھر میں؟“

”نہ صبحی بھائی اور نہ اکرم بھائی۔ سب میچ کھیلنے گئے ہوئے ہیں اور چائے ابھی ابھی سب نے پی ہے۔“ بڑے آرام سے فروانے اس کی آمد کو درخود اعتنائہ جانتے ہوئے کچن سے باہر نکلی.....اور.....اور لاؤ لٹچ کی جانب رخ کیا۔

توقیر اس کی صاف کوئی سے واقف تھا۔ اس لیے برامانے بغیر اندر کی جانب بڑھا اور تیزی سے باہر آئی اریبہ سے ٹکرایا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی کتابیں، کچھ کاغذ اور فائل نیچے پھسل کر گرتے چلے گئے۔

”اوہ.....“ توقیر سائیڈ پر ہوا۔ ایک ٹکڑا توقیر پر ڈال کر اریبہ جھک کر اپنی کتابیں اٹھانے لگی۔

”سواری باد بہاری.....اتنی برق رفتاری سے کہاں کا سفر کر رہی تھی؟“

”ضروری کام سے.....“

”مگر آج تو چھٹی ہے۔“

”تو چھٹی کے دن کام کرنا منع تو نہیں۔“ پیڑیں سمیٹ کر کھڑی ہوئی۔

”ہاں منع تو نہیں ہوتے۔“ انگلی سے سر کھجایا۔ اس کے چہرے پر بڑی شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔ ”چھٹی تو آرام کے لیے ہوتی ہے ناں۔“

”ہاں.....چھٹی ہو کام ہو اور پیسے بھی ابھیل رہے ہوں تو کر لینا چاہیے۔“ اس نے قدم آگے بڑھائے۔

”میں نے سنا ہے کہ تم نے کہیں کورس کی جاب بھی کر لی ہے۔“ اس کے پیچھے قدم بڑھائے۔ اریبہ نے قدم روک کر پلٹ کر اسے دیکھا۔

”کورس۔“ گہرا سانس لیا۔ ”ہاں.....کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کوئی بوڑھا وجود ہماری خدمات سے خوش و مطمئن اور شانت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کورس بننے میں۔“ توقیر کے شوخی ظرافت بھرے چہرے کو تنجیدگی سے دیکھا۔

”کیوں.....تمہیں چچا جان نے منع نہیں کیا؟“ اگلا سوال بڑے تفکرانہ انداز میں تھا۔

”یہ میرا تروبو ہے یا.....پوچھنا چھ؟“

”ای بلا رہی تھیں تمہیں۔ اسے بیگ میں بٹلت بھرے انداز میں ہاتھ مارتے دیکھنا پوچھا۔

”ہاں آؤں گی کسی دن چچی کو میرا سلام کہنا۔ اس کے کہے گئے سوال کو بیکسر نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ اریبہ درانی کے چہرے پر بڑے حزن رسیدہ سے تاثرات تھے۔ آنکھوں میں بھگی سی چمک لیے بیگ سنبھالتی کوریڈور سے گزری لان میں اتاری بائیں جانب کو چچا اعظم درانی اپنے آسٹریلیین طوطوں کے ساتھ مشغول تھے۔

”خدا حافظ چچا جان۔“

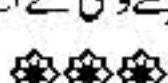
روش سے گزرتے ہوئے با آواز بلند ہاتھ ہلا کر اپنی راہ پر گزرتے ہوئے کہا اور سیاہ گیٹ کا درمیانی دروازہ پار کر کے باہر روڈ پر نکل گئی۔

اور اس کے پیچھے آتا تو قیر درانی یک لخت ہی سنجیدہ ہو گیا۔ اسے اس کے سوال کا جواب مل گیا۔

چچا اریبہ کی کورس کی جاب میں خوش تھے۔ کیا ان کی اجازت تھی۔ ایک ملال سا اس کے اندر اترنے لگا۔

طبیعت کی شوخی ظرافت اچانک ہی رخصت ہوئی اور اک اداسی سی طاری ہونے لگی۔

ایک دم سے ہی جانے کے لیے پلٹا مگر توقیر کی آواز پر رکنا پڑا۔ لاؤنج میں بیٹھے صبحی نے اسے دیکھ لیا تھا سو پلٹنا پڑا۔



کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے جو یا تو ازلی بد قسمت ہوتے ہیں یا قسمت انہیں بار بار آزماتی ہے یا خدا کی جانب سے ان کی زندگی میں آزمائش آتی رہتی ہے اور صبر و شکر سے وہ پے در پے آنے والے حالات کو قبول کر لیتے ہیں۔ آزمائش سے صبر و تحمل سے نکلتے ہیں اور یہ اپنی قوت برداشت سے بہتر راہ کا تعین کر لیتے ہیں۔

ایسے لوگوں میں ایک نام اریبہ کا تھا جو پیدا ہوتے ہی آزمائش کے جھولے میں گری۔ جھولا زور سے ہلنا اونچا اور اونچا ہوا پھر ایک جھٹکے سے نیچے آیا اور پھر جھولنا چلا گیا۔ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں.....



پیدا ہوئی تو کچھ عرصے بعد ماں کا انتقال ہو گیا۔ جب تک دادی حیات رہیں تو انہوں نے ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ان کے انتقال کے بعد اس کو کون دیکھتا.....؟ عظیم درانی نے اس کے خیال کی وجہ سے دوسری شادی کر لی حالانکہ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں پرورش کی نہیں تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پال تو دادی نے دیا تھا۔ اس کی شخصیت میں سلجھاؤ، توازن اور ترتیب تھی۔ اسے ایک بہترین تربیت یافتہ انسان کی ضرورت تھی جو اس کی صلاحیتوں کو نکھارتا اور سنوارتا۔ اگر عظیم درانی اس پر توجہ دیتے تو اسے دوسری ماں کی ضرورت نہیں تھی۔

مگر کچھ نظری جملیں اور صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کی ضرورت اور اہمیت سدا رہتی ہے۔ ساتھی کے بغیر انسان ساری عمر نہیں گزرا سکتا۔ اعظم درانی نے شادی کر لی انہیں نبوی مل گئی مگر جس کی وجہ سے شادی کی اسے تو ماں نہ مل سکی۔ وہ آتے ہی عظیم درانی کو لے کر الگ ہو گئی۔ شروع میں اریبہ ان کے ساتھ رہی۔ اریبہ میں کچھ خدا و صلاحیتیں تھیں۔ اسے لوگوں کی پہچان فوراً ہو جاتی تھی۔ رقیہ خاتون کا سلوک، لہجہ اسے بہت کچھ باور کرا دیتا تھا۔ پھر ان کی مہمان داری بہت تھی۔ آئے گئے کے لیے بڑی سہولت سے رقیہ خاتون اسے آواز دیتیں۔ ”اریبہ چائے بناؤ۔ شربت لاؤ۔ مہمانوں کو دیکھو۔ کچن میں دیکھو۔ آج دعوت ہے، کل جانا ہے۔“ اسے گھر کی مکمل خادمہ بنایا ہوا تھا۔ اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔ سو دوسرے سال ہی وہ واپس ملک ہاؤس آ گئی۔

ملک ہاؤس کا اوپر کا حصہ عظیم درانی کی رہائش گاہ تھی مگر الماس کے انتقال کے بعد دوسری شادی کے وقت انہوں نے اوپر کا حصہ چھوڑ دیا اور ماں کے تعاون سے ایک فلیٹ لے لیا۔

اوپر کے حصے میں اعظم درانی نے بیانی بیٹی کو رہنے کی اجازت دے دی۔ وہ کرائے کے گھر میں رہتی تھی۔ جب اریبہ واپس آئی تو اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ انکیسی کرائے پر تھی۔ فروا اور صامین کے ساتھ کمرہ شیئر نہیں ہو سکتا تھا۔ سواس نے اوپر بنے اسٹور کا کاتھ کباڑ نکال کر اسے رہائش کے قابل بنالیا۔ عظیم صاحب نے بیٹی کی سہولت کے خیال سے کچھ پیسہ اوپر لگا کر اسے آرام دہ کر دیا۔ وہ اریبہ کے شوقی علم سے بھی واقف تھے اور خاموش طبیعت اور ذہانت سے بھی۔

پھر انہیں رقیہ کی عدم دلچسپی بھی معلوم تھی۔ اس نے اریبہ کو محبت بیا اور توجہ نہیں دی تھی۔ شادی کے بعد ان کی توجہ بھی اریبہ پر سے ختم ہو گئی تھی۔ کچھ وہ اپنے ایگزام اور تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اپنے خول میں سمٹ گئی۔

اس لیے بھی انہوں نے اسے ملک ہاؤس میں رہنے کی اجازت دی کہ اپنے چچا کے بچوں کے ساتھ اس کا میل ملاپ تھا۔ نایا کا گھر بھی قریب تھا۔ پھوپھی بھی آتی جاتی تھیں اور فرید بھائی بھی قدرے فاصلے پر رہتے تھے۔ اسے زیادہ تنہائی اور اکیلے پن کا احساس نہ ہوگا۔

شاید وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ماں کی موت نے اور دادی کی جدائی نے اسے ساری عمر کے لیے تنہا واداس کر دیا ہے۔ اس کے اندر کی تنہائی کی کوئٹیس قد آور ہوتی جا رہی ہیں۔

پہلی بار وہ اس کا کمرہ دیکھنے اس کے پاس آئے تو رقیہ نیچے ہی رک گئی تھیں۔

اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ کارپٹ پر اپنے میٹرس پر بیٹھی ہوئی تھی اور گرد کتابیں بکھری ہوئیں تھیں۔ ایک کونے میں کچھ اخبار تھے۔ بک ریک پر کتابیں رکھی تھیں۔ در پیچے کے پردے کھینچے ہوئے تھے۔ کمرے میں ٹھنڈک سی تھی۔ قریب ہی چائے کا خالی مگ رکھا ہوا تھا۔

ایک دم ہی انہیں احساس ہوا کہ کتنی اکیلی واداس ہو گئی ہے اریبہ.....

اک ترم ساجد بہو جو دم میں سرایت کر گیا۔

”ابو آپ.....“ اچانک ہی ان کی موجودگی کا احساس ہوا تو چونک کر سیدھی ہوئی۔ اس کے چہرے پر ایک خوشی کا تاثر ابھرا۔ ”کب آئے.....؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے۔ بیٹا پڑھ پڑھ کر تھکتی نہیں ہو؟“ اس کے قریب بیٹھ گئے۔

”بابا! پڑھ کر بھی کوئی تھکا ہے؟“ دھیرے سے مسکرائی۔

”تمہیں کمپیوٹر کی ضرورت ہوگی؟“

”جی ہے میں نے عمر بھائی سے کہا ہے کہ اگر کوئی سیکنڈ ہینڈ کمپیوٹر مل جائے تو.....“

”ہوں..... اور بیوی بھی نہیں ہے۔“ کمرے میں نگاہ کی۔

”بابا! اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میری بکس ہی کافی ہیں میرے لیے۔“

”بے شک! تھکے ہوئے ذہن کے لیے تفریح بھی چاہیے۔“ اور بس وہ مسکرا دی اس کے چہرے پر خوشی تھی۔ بابا اس کے پاس آتے ہیں بھولے نہیں۔

اس روز انہوں نے بہت ساری باتیں کیں اس نے بابا کو بتایا کہ وہ ایم فل کرنے کے بعد ٹیچر رشپ کے لیے اپلائی کرے گی یہ اس کا شوق ہے۔

بابا نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی۔

اگلے روز اس کے کمرے میں کمپیوٹر کا اضافہ ہوا اور کچھ عرصے بعد ٹیلی ویژن۔ اس کے علاوہ گاہے بگاہے عظیم درانی نے اپنی بیٹی کی ضروریات کا خیال رکھا۔ اس سے دور ضرور تھے مگر بھولے نہیں تھے۔ اریبہ پر توجہ تھی ان کی۔

مگر یہ ساری بھی اس کے اوپر سے اٹھ گیا۔

ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہ سچے مچے میں یتیم ہو گئی جانے عظیم درانی کے دل میں کیا تھا کہ اس کے سر پر ساریہ مضبوط کر گئے۔ اس وقت وہ بی اے کے رزلٹ کے بعد ایم اے کے ایڈمیشن کی تیاری کر رہی تھی کہ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس کے حواس قحط ہو گئے تھے۔ ایک عرصے کے لیے..... مگر..... مرنے

وانوں کے ساتھ مرنے جاتے صبر بھی آ ہی جاتا ہے۔ دل بہل ہی جاتا ہے۔ دنیا ایسی ہی جگہ ہے۔

”اب یہ ہماری ذمہ داری ہوگی۔“ دکھ کے گہرے سمندر سے ابھری تو چچی کا پہلا جملہ اس کے کانوں میں پڑا اور وہ کچن میں کھڑی رہ گئی۔

”اچھا تھا اگر عظیم اس کا کچھ کر جاتا۔ ہمارے پاس کیا ہے جو اس کا خرچہ بھی برداشت کریں۔ مہنگائی اس قدر ہے۔ ہمارے اپنے بچے پڑھ رہے ہیں۔ صرف ابھی دو بچوں کے فرض ادا ہوئے ہیں۔“

چچی کی تنگ دلی کا اندازہ تو تھا مگر وہ اس قدر تنگ نظر بھی ہوں گی یہ معلوم نہ تھا۔ ابھی تو اس کے باپ کا چالیسواں ہوا تھا۔ ابھی تو دل ٹھیک سے بہلا بھی نہیں تھا۔ ابھی تو اس نے کچھ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک اور فکر کی دلدل میں گر گئی۔

ابھی تک بابا کے جانے کا دکھ ہی سہی تھی کہ کھانے پینے، تعلیمی مراحل طے کرنے کے خرچے کہاں سے ہوں گے؟

”ہاں..... کہاں سے ہوں گے.....؟“ کمرے کے چہار جانب نگاہ کی۔ چچی اور بڑی چچی کا مطلب تو یہی ہے ناں..... رہائش..... کہیں یہ رہائش یہ پناہ گاہ اس سے نہ چھین جائے۔ ایک اور فکر..... اسے اپنا انتظام کرنا ہوگا..... دوسری امی اسے کیا دیں گی بابا کا کیا تھا؟ اسے کیا خبر سب کچھ تو ان کا ہی تھا۔

آنکھیں بھیگنے لگیں۔

دو چچا..... ایک نایا..... ایک پھوپھی کی موجودگی میں اسے سوچنا پڑے گا۔ ایک فکری سوال کا آکٹوپس دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔

اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

گزر رتے دنوں کے ساتھ ساتھ چچی کا تنگ انداز چچا کا رگی سا لہجہ، نایا ابو کا علیک سلیک سا انداز..... کہیں دلجوئی نہیں، مہربانی نہیں، دکھ کی شدت کو کم کرنے کا سلسلہ نہیں، آخر ان کا خون تھی۔ مگر اس نے حقیقت کی آنکھ کھولی۔ واقعی مہنگائی بہت ہے۔ مہنگائی محبت سے مشروط ہے۔ جتنی مہنگائی اتنی محبت سکرے سٹے یا پھیلے گی تو اس سے پہلے کہ سب کے رویے بدلیں، لہجے بدلیں، مجھے کچھ سوچنا چاہیے۔ اس گھر میں رہتے ہوئے میں اجنبیت کیسے برداشت کروں گی۔ اجنبی لہجے، اجنبی چہرے مجھے

اور تنہا نہ کر دیں پھر..... پھر یہاں سے نکل کر میں کہاں جاؤں گی؟

حقیقت کی دوسری آنکھ بھی کھول لی۔ باہر بھڑیے ہیں، خوف ہے، دہشت ہے، عقابانی نظریں ہیں..... دھیرے سے کشن کو دم میں رکھا تو ایک تحفظ کا احساس ارد گرد پھیلتا چلا گیا۔ اپنوں کے درمیان تو ہوگی۔ رسوائی، بدنامی، اکیلے پن کا خوف تو نہیں ہوگا۔ چچی کی تنگ نظری، چچا کی بیگانگی کے ساتھ تنہائی کا خوف تو نہیں ہوگا۔ صامین اور فروا کا ساتھ تو ہوگا۔ کچھ تو اپنا ہوگا۔ دھیان کے سب راستوں میں لمحاتی ہی کسی ساتھ تو ہوگا۔

اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایم اے ریگولر کرنے کا خیال دل سے اٹھایا اور پرائیویٹ ایم اے رجسٹریشن کروالیا۔

اس کے بعد قریبی اسکول میں جاب کر لی۔ سہیلی بی اے بغیر پریکٹس کے کیا تنخواہ ہو سکتی تھی مگر گزرا رے لائق تھی۔ کچھ تنگ نظر سنبھلا۔ پھر محلے کے ہی نویں دسویں کے بچوں کی نیوٹن مل گئی۔ گھر جا کر پڑھانا تھا۔ اس کا مسئلہ حل ہوتا گیا۔

چچا نے رسمی سا اس کی جاب پر اعتراض کیا۔

”کیا ضرورت تھی؟ اریبہ جاب کی؟“

”ارے آپ بھی حد کرتے ہیں۔ کر لی تو کیا ہو گیا۔ ماشا اللہ ذہین ہے عقل مند اور سمجھ دار ہے کر سکتی ہے۔ انسان پڑھتا کیوں ہے۔ مہنگائی کس قدر ہے چار پیسے آتے

بڑے لگتے ہیں کیا؟“

آگے بولنے سے پہلے ہی انہوں نے میاں کو ٹھوکا دے کر ٹوک دیا اور وہ چپ ہو کر رہ گئے۔

”میں تو صامین سے بھی کہتی ہوں اسکول میں پڑھائے مگر اس کا دماغ ہے نہ عقل۔“ ساتھ ہی انہوں نے جتا بھی دیا اور وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

عظمت چچا نے درخور اعتنائی نہیں جانا اتنا ہی کہہ دیتے کہ بیٹی ہو ہماری کیا ہوا..... عظیم چلا گیا ہم تو ہیں ناں ابھی، مگر دل اتنے وسیع اور خیال خوب صورت ہوں تو

بات ہی کیا ہے۔ شاید زندگی کے ہر معاملے میں مہنگائی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

اک حزن نے وجود کا احاطہ کر لیا۔

اور آخر اجات اور مہنگائی کا توازن کرتے کرتے وہ محنت محنت اور زیادہ محنت کرتی چلی گئی۔

ایسے ہی قلم چل پڑا تو آرٹیکل اور کہانی لکھنے کا سلسلہ بھی چل پڑا۔ پیسے ملے تو تو جس جانب بھی مہذول ہونے لگی۔

اس کی زندگی کا دائرہ اپنے خول میں سمٹ گیا۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے کس کو کدھر جانا ہے؟ کون آ رہا ہے اسے خبر نہ تھی۔ مصروفیت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔

چچی خوش تھیں انہیں اضافی رقم ملنے لگی جس سے انہوں نے چپکے چپکے صامین کے جہیز کے لیے چیزیں بنانے کے لیے کمپنی ڈال لی۔

کچھ پیسہ وہ اپنے خرچے کے لیے رکھ لیتی تھی۔

اسی طرح اس کا ایم اے مکمل ہو گیا۔ ایم فل کا ارادہ اس نے کچھ عرصے کے لیے ترک کر دیا۔ کچھ پیسے جمع کر کے یا پھر کوئی اور معقول جاب مل جائے۔ اسکول کی اس

جاب میں محنت بہت اور تنخواہ کم تھی۔ اس بہتری کے لیے وہ اشتہارات دیکھتی تھی کہ اسے یہ کونس کی جاب مل گئی۔



سز گیلانی گریس فل سی بوڑھی بیار خاتون تھی۔ ان کے تینوں بیٹے باہر رہتے تھے۔ تعلیم باہر حاصل کی نوکریاں ادھر ہی کیں اور پھر شادی بھی انہوں نے وہاں مقیم قبیلی میں کیں۔

یہاں وہ بالکل اکیلی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ خاندان کے زیادہ تر افراد باہر ہی رہائش رکھتے ہیں۔ کاموں کے لیے بہت سارے ملازم تھے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ کوئی انہیں مکمل توجہ دے سکے۔ انہیں اخبار پڑھ کر سنائے۔ بیماری میں خیال رکھے۔ انہیں ہاسپٹل لے کر جائے۔ انہیں اپنی کمپنی دے کیوں کہ وہ انجوائے منٹ چاہتی تھیں۔ انہوں نے کئی این جی اوز اختیار کر رکھی تھیں مگر اپنی صحت اور بیماری کی وجہ سے باقاعدہ وزٹ نہیں کر سکتی تھیں۔ مالی امداد اور مشوروں سے نوازتی رہتی تھیں۔ ہاں کبھی دل چاہتا تو تبدیل آب و ہوا کی خاطر دورے کر لیتی تھیں مگر کم کم.....

انہیں اریبہ بہت اچھی لگی۔ ذمہ دار گریس فل اور ہمدردی۔ بڑی توجہ سے انہیں اہمیت دیتی جتنی ہلکی ہلکی باتوں سے بہلاتی جبکہ اس سے پہلے جو لڑکی انہوں نے رکھی تھی۔ وہ ان پر کم گھر کی دوسری چیزوں پر زیادہ نظر رکھتی اور اس کی دلچسپی ان چیزوں پر زیادہ تھی کہ ان کی جائیداد کتنی ہے اور بیٹے جب باہر سیٹل ہیں تو وہ اتنی زیادہ جائیداد کیا کریں گی؟

اریبہ کا انٹرویو کرنے سے پہلے ہی اسے چٹا کر دیا اور ایک مخلص ہمدرد نمونس وغم خوار کے سلسلے میں ایک بار پھر پریشان تھیں کہ انہیں ہمدرد ساتھی میسر آ گیا۔ وہ اریبہ کے اخلاق اس کی محنت اور اس کے عزائم کے ساتھ ساتھ شب و روز محنت سے بہت متاثر تھیں۔ آج کل کے زمانے میں ایسی لڑکیاں کب ملتی تھیں اور ذرائع سے پیسہ کمانے کی راہ نکال لیتی تھیں اس کی پرسنالٹی سے بھی متاثر تھیں۔ ایک لیے دیئے رہنے والا انداز تھا۔ اپنے کام سے دلچسپی کا عنصر غالب رہتا تھا۔

”میرے خیال میں تم سے ملاقات کے لیے اب نام لینا چاہیے۔“ اس روز تو قیر سے سامنا ہوا تو بے ساختہ کہہ اٹھا۔

”کوئی کام تھا آپ کو؟“

”نہیں تمہیں گاؤں آف آؤٹپیش کرنا ہے اتنی مصروفیت اتنے کام سے وقت نکال کر تم نے ہمیں پہچان لیا۔“

سر سے لے کر پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ مسکرا دی۔

”ای آئی جی ملوگی نہیں۔“

”ارے پھوپھو۔ کب آئیں؟“ مسکرا کر خلوص سے کہا اور اپنی فائل اور بیگ تھام کر لاؤنچ کی جانب بڑھی۔ ابھی ابھی وہ لائبریری سے آئی تھی کچھ فریش ہو کر اس کا ارادہ نیگم ہمدانی کی طرف جانے کا تھا۔ پھوپھو سے اسے خصوصی انیٹ اور پیار محسوس ہوتا تھا۔

”السلام علیکم پھوپھو!“

”علیکم السلام“ انہوں نے اس کی جانب دیکھا ان کا انداز کچھ خشک سا محسوس ہوا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ کچھ نہ خیال کرتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

”ٹھیک ہوں تم سناؤ نوکری کیسی جا رہی ہے۔ تو قیر بتا رہا تھا تم چار چار پانچ پانچ نوکریاں کر رہی ہو۔“ اس کا ناقدا نہ جائزہ لیا۔ اریبہ ٹھٹھک گئی۔ ان کا لہجہ ان کا انداز..... ان کی نگاہ.....

”ایسی کون سی ضرورتیں ہیں تمہاری..... جن کا پیٹ بھرنے کے لیے تم رات گئے گھر آتی ہو؟“

اریبہ کے تمام حواس ٹھٹھک گئے۔

”ای! تو قیر جبر ہوں کر ماں کو دیکھنے لگا۔“

”کسی سے پوچھتے بنا ہر فیصلہ خود کرتی جا رہی ہو..... اتنی خود سر ہوں۔“

”کسی نے مجھ سے پوچھا کسی ہوں.....؟ تمہاری ضروریات کیسے پوری ہو رہی ہیں۔ تم نے کیا کھانا ہے؟ تمہاری تعلیم کے خرچے کہاں سے پورے ہوں گے اور..... اور تم کتنی اکیلی ہو۔ آؤ میرے پاس آ کر رہو۔“ اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ اخلاق مروت اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر ا ہوا تھا۔

تب ہی تائی امی چچی کے ساتھ اندر آ گئیں۔ نگاہ ان پر پڑی تو ایک گہری سانس اس کے اندر راترتی چلی گئی۔ پھوپھو کا لہجہ اور انداز بد لنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ تائی امی کب اس سے خوش تھیں۔ افراسیاب کا معاملہ ابھی تازہ تھا۔ نگاہ اٹھا کر تو قیر کی جانب بڑھی۔

یہ شخص.....

”اریبہ! بڑوں کو سلام کرنا بھول گئی ہو کیا؟“ تائی کی آواز نے گڑ بڑا دیا۔

”السلام علیکم۔“ فائل سنبھالی۔

فرخندہ نے ٹیکھی نگاہ تو قیر پر ڈالی۔ (بچے تجھے تو گھر جا کر ٹھیک کرتی ہوں۔ خود سر ہے عظیم کی طرح۔ اس نے کب بڑے بھائیوں کو اہم سمجھا تھا۔ اپنا ہر فیصلہ خود ہی کرنا تھا۔) وہ سوچنے لگیں۔

تائی نے چٹا چائے ہوئے ٹیکھے انداز میں کہا۔

”بہت پاؤں کھل گیا ہے تمہارا۔ لگام ڈالو ان میں۔“

”پھوپھو! بچی کو معلوم ہوتا ہے میں کہاں جا رہی ہوں اور کدھر سے آرہی ہوں پیسہ میری ضرورت ہے مجھے آگے بڑھنا ہے۔ ایم فل کرنا ہے یہ چھوٹی موٹی نوکریاں بڑی جاب حاصل کرنے کے وسیلے ہیں مجھے کون رکھے گا۔ کون میری ضروریات پوری کرے گا؟ اگر میں خالی ہاتھ ہو جاؤں تو۔“ دھیرے سے سر اٹھا کر دھیسے لہجے میں نم پلکوں کو چھپا کر پھوپھو کو دیکھا۔ ”پھوپھو! میرے پاس تعلیم ہے۔ حوصلہ ہے استقامت ہے۔ میں بوجھ نہیں مننا چاہتی۔“ بیگ تھام کر اٹھی اور باہر نکل گئی۔

”دیکھ لیا۔“ فرخندہ کو اریبہ کا انداز برا لگ گیا۔

زہرہ کی جانب دیکھا۔

”دیدہ دلیری..... دیدہ ہوائی۔“

”ای امی! کیا ہو گیا ہے آپ کو.....؟ وہ کسی پر بوجھ نہیں ہے اپنا خرچا خود اٹھا رہی ہے۔ کسی تاپا! چچا! پھوپھو پر بھاری نہیں ہے۔ پھر بھی آپ لوگ.....“ تو قیر کو ماں کا انداز برا لگ گیا۔ صوفے پر بیٹھ کر ترخ کر کہا۔

”دیکھ لو فرخندہ! بیٹے کے تئیں..... لگام ڈالنے کی ضرورت ہے۔“ ٹیکھے لہو سے فرخندہ کو دیکھتے ہوئے تو قیر کی جانب اشارہ کیا۔

”میں نے تو اسی لیے افراسیاب کو باہر بھیجا دیا ہے۔ کیسا دنگل کیا تھا۔ اب کیسے تیر کی طرح سیدھا ہو گیا ہے اسی لیے میں اب ظہیر کی منگنی بھی کر رہی ہوں۔ تم بھی بیڑیاں ڈال دو پاؤں میں۔“

”ہاں..... اس سلسلے میں آئی تھی میں کہ.....“

”ای! گھر چلیں..... آپ..... ہر سلسلے کو ادھر ہی چھوڑ کر۔“ تو قیر تنک کر کھڑا ہوا۔ اس وقت اسے بڑی ممانی زہرہ بری لگ رہی تھیں کس قدر مکار اور کمینہ فطرت کی تھیں۔ ایک معصوم لڑکی کو کیسے کیسے القاب سے نوازا رہی تھیں۔

”تو قیر جاؤ تم..... مجھے بھائی جان چھوڑ دیں گے۔“ فرخندہ نے اسے گھورتو قیر پاؤں چٹخ کر باہر نکل گیا۔

”اے سنبھال لو فرخندہ کل کو یہ کہے گا کہ اس لڑکی سے شادی کرنا ہے اور یہ کیا لے کر آسکتی ہے خالی ہاتھ پاؤں کے سوا۔“

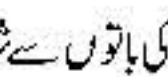
”اور کیا.....؟ روز چکر اسی لیے لگتے ہیں۔“ زہرہ کو بھی خیال آیا۔ ساتھ ہی اپنی صائمیں کا بھی خیال آیا۔ تو قیر کے ساتھ اس کی جوڑی کتنی بچے گی۔

”ہاں..... کرتی ہوں کچھ اس کا بندوبست۔“ انہوں نے چائے لے کر آتی صائمیں کو دیکھا جس کے چہرے پر ذومعنی مسکراہٹ تھی۔ کسی خیال میں گم تھی۔

اور روشن آرا کو اپنی نازک سی فرح کے لیے تو قیر سے بہتر کوئی نہیں لگ رہا تھا۔ انہیں تو قیر کو ہر حال میں دلدادہ دینا تھا۔ اسی لیے تو فرخندہ کو اریبہ کے خلاف کیا تھا۔ کہاں وہ جتنی کی محبت میں مری جا رہی تھیں کہاں اب.....

تیسری آنکھ سے انہوں نے جائزہ لیا۔ گلے تک وہ اریبہ کے خلاف بھری ہوئی لگی۔ ان کا مقصد حیات پورا ہو گیا۔

ان کی زندگی کا نصب العین ہی یہ تھا کہ اپنی پسندیدہ چیزوں کو اپنے دائرہ حصار میں لے لو۔



”یہ..... یہ اپنے ہیں۔ وہ ان کا خون ہے۔ یہ اپنا نیت کے خونی رشتے ہیں۔“

ڈکیر سے انداز میں اپنے میٹر لیس پرگری۔ کس قدر خشک اور محبت سے خالی دل ہیں ان کے کس قدر سخت دل اور پتھر لوگ ہیں بجائے میرے نمونس ہمدرد وغم خوار بننے کے میرے سر پرست بننے کے مجھے ٹیکھی نظروں سے دیکھتے اور افرام لگاتے ہیں۔

”اے..... خدا..... اے خدا.....“

آنکھیں بند کر کے اس نے رب العظیم کو پکارا۔

”ان لوگوں کو عقل سلیم عطا کر انہیں ہدایت دے اور مجھے کسی گناہ سے بچا.....“

صرف دل سے دعا کی۔

”اریبہ تم امی کی باتوں کا خیال مت کرنا امی تو بس ایسے ہی.....“ تو قیر ماں کی باتوں سے شرمندہ تھا۔ اگلے دن بطور خاص اس کے پاس آیا۔

”تو قیر! کوئی یوں ہی بات نہیں کر دیتا۔ یہ سب لوگ تجھ دار ہیں۔ انہیں کسی بات کا خوف ہوتا ہے۔ اب..... اب کیا میں جینا چھوڑ دوں۔“ اس کا لہجہ گداز تھا۔ ”اور بہتر یہ ہے کہ تم یہاں مت آیا کرو اور آیا کرو تو بس مجھ سے بات مت کیا کرو۔ پھوپھو کو جو خوف ہے اسے ختم کر دو۔ بالکل اسی طرح سے جیسے تائی امی نے حفاظتی بند باندھ لیے ہیں۔“ اس نے سر جھکا کر کارپٹ کی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”میری منزل بہت دور ہے ابھی۔“

”اریبہ! تو قیر نے لال لال سے اسے دیکھا۔“ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ لہجہ بے ساختہ تھا۔ اریبہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ تب ہی فری مڑے لے کر آ گئی۔

تو قیر ریوٹ سے چھینل بد لنے لگا۔ اریبہ نے رکی ہوئی سانس کو بحال کیا۔

”یہ لیس چائے گرم..... سچ تو قیر بھائی چائے کے علاوہ بھی کچھ پی لیا کریں کھالیا کریں۔ دوپہر میں آپلی نے گرم گرم کر لیے قیہ بنایا ہے۔ امی بھنڈی کوشت بنا رہی ہیں۔ کھانے کا نام ہے کھانا کھا کر جیے گا۔ صائمیں بازار گئی ہوئی ہے۔“ فری نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی۔

”بس۔“ تو قیر مسکرا دیا۔ ”تمہاری ٹرین چھٹی ہے تو رکے کا نام نہیں لیتی۔ آج تو اریبہ بھی چھٹی کی وجہ سے نظر آرہی ہے۔ لگتا ہے کوئی کام نہیں ہے۔“ مسکرا کر اریبہ کو



دیکھا۔

”نہیں کام تو بہت ہیں بس موڈ نہیں ہو رہا تھا۔“

”انسان کو کبھی فارغ بھی رہ لینا چاہیے۔“ توقیر نے گم صم سی اریبہ کو دیکھا جو اسکرین پر کچھ ہرکنز کیے بیٹھی تھی۔ تب ہی وہ اٹھی اور باہر نکل گئی تو قیر بیٹھا دیکھتا رہ گیا۔ ابھی تو اپنے سوال کا جواب لینا تھا اور..... وہ چلی گئی۔

”تو قیر بھائی! شادی کے لیے کیسی لڑکی چاہیے آپ کو؟“ فری نے مسکرا کر چیخڑنے والے انداز میں دیکھا۔

”کیوں..... میری شادی کا کیا سوال؟ پہلے حنا کی ہوگی۔“ کب منہ سے لگا لیا۔ دماغ خیال اریبہ کی طرف تھا۔

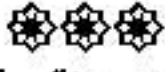
”منگنی تو ہو سکتی ہے۔ پھوپھو آج کل آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔“ شوخی سے دیکھا۔ ”لوگ لڑکیوں کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں اور وہ اپنے اکلوتے لڑکے کی وجہ سے پریشان ہیں۔“ فری نے ایک اور انکشاف کیا۔ توقیر چونک گیا۔

”کس سے.....؟“ بے ساختہ منہ سے نکلا۔

”یہ تو پھوپھو کو پتہ ہو گیا آپ کو۔“ شرارتی انداز میں کہا۔ ”ویسے آپ کی کوئی پسند ہے تو مجھے بتا دیں میں آپ کی سچی خیر خواہ ہمدرد اور غم خوار ہوں۔“ شرارت سے کہا۔ توقیر اسے دیکھتا رہا..... کو یا امی کا کل یہاں آنا بے بنیاد نہیں تھا۔ چھوٹی ممانی نے مرچ مٹھا لکھے کے ساتھ اس کے آنے کا بتایا ہوگا اور بڑی ممانی کا تو کیا ہی کہنا۔ گھریلو سیاستوں میں ماہر ہیں۔ چپقلش بڑھانے میں ماسٹر۔

”آپ اپنا نقطہ نگاہ سمجھائیے بتائے باقی میرا کام ہے۔“ فری اپنی دھن میں تھی تو قیر اسے دیکھنے لگا۔

”میرا نقطہ نگاہ مجھ پر واضح ہے۔ اس پر واضح ہو جائے تو بات ہے۔“ کپ سائیز ٹیبل پر رکھ دیا۔



بارش لٹی ہوئی چھوٹی پریزیادہ زور سے برسی ہے۔ آزماتش گھر دیکھ کر تو اتار سے آتی جاتی ہے اور زخم ہمیشہ اس سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں عنایت کرتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ ان کے بس کی بھی بات نہیں رہتی اور رشتے یا رشتے خون کے ہوں اپنائیت کے ہوں یا خلوص کے آگینے کی طرح ہوتے ہیں اور آگینوں کو ذرا سی ٹھیس کی ہی ضرورت ہوتی ہے پھر کیسا اعتبار کیسا مان کیسا فخر.....

”یہ..... یہ بات تو قیر کیوں نہیں سوچ رہا۔ اس نے کیسے اتنی بڑی بات کہہ دی۔“

شادی

”شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ کیا ہے میرے پاس سوائے محتاج زندگی کے۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”کیا بات ہے اریبہ کچھ پریشان ہو؟“ سزگیلانی نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا۔ اریبہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا.....؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے کتاب سیدھی کی۔

”میں تو تم سے اپنی ہر بات ہر دکھ شہیز کرتی ہوں۔ ہر مسئلہ بتائی ہوں اور تمہیں جی بھجھتی ہوں۔“

(مجھے اس رازداری کے پیسے ملتے ہیں)

”تم مجھے اپنا ہم راز سمجھ سکتی ہو۔ مشورہ لے سکتی ہو۔ اپنا مسئلہ اپنا دکھ اپنا ٹھکر شہیز کر سکتی ہو۔“

دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اور مجھے ماں سمجھ سکتی ہو۔“ مشتھانہ انداز میں کہا۔

”ماں..... اس کے دل سے ہوک سی اٹھی اور آنکھیں بھیگ گئی۔ معلوم نہیں ماں باپ جاتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے پیچھے ان کے پیارے لوگ کس طرح سے رہیں گے۔

”بتاؤ..... کیا ہوا ہے؟“ دھیرے سے اٹھ بیٹھیں۔

”کچھ نہیں۔“ انکار میں سر ہلایا۔ ”کوئی مسئلہ نہیں۔“ انہیں دیکھا۔

”اور مسئلہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ سب کچھ تو واضح ہے۔ پھوپھو کی ناپسندیدگی گریز اور ناکواریت کیسے وہ مجھے بہو بنا سکتی ہیں کیا ہے میرے پاس اور یہ تو قیر.....“ بیٹھے بیٹھے بھر سے گم ہونے لگی۔

توقیر کو مجھ میں کیا نظر آیا۔ نہ حسن..... نہ خوب صورتی..... نہ کشش نہ زور..... ناز میں نہ جاسیداد.....

ہو سکتا ہے ترجم کا جذبہ ہو۔

سوچوں کے سلسلے نکلتے چلے جاتے ہیں۔

”کہہ دیئے سے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ ہم اور تم ایک دوسرے کے بہت اچھے راز داں بن سکتے ہیں۔“

(راز داں.....) اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ تھی۔ (میرا تو کوئی راز ہی نہیں ہے)

”میرے کزن نے مجھے پر پوز کیا ہے۔“ سر اٹھا کر کچھ لمحوں تک انہیں دیکھا اور دل میں سوچا اور انگلیاں مسلتے ہوئے اپنا مسئلہ کہہ دیا۔

”تو اس میں اتنا سوچنے والی کون سی بات ہے۔ یہ تو ایک اچھا قدم اور نیک فکرون ہے۔“

”نہیں..... یہ ایک بہت برا فکرون ہے۔ جب اس کے گھر والوں کو پتہ چلے گا تو انہیں بہت غصہ آئے گا۔ بے شک میں ان کی بہت سی ہوں مگر اس نقطہ نظر سے مجھے کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا کہ اپنی بہو بنائے۔ ان سب کی نظر میں میں ایک آزاد خیال خود پسند اور خود پرست لڑکی ہوں۔ اپنی من مانی کرتی ہوں پھر میں انہیں کیا دے سکتی ہوں۔“ رک کر گہری سانس لے کر انہیں دیکھا۔ ”نہ جاسیداد نہ چیز نہ پیسہ نہ حسن۔“ بیگم گیلانی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

”اور نہ میں خود غرض ہوں اور نہ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں بد دعاؤں کی زمین پر اپنا گھر بنا کر ساری عمر ناپسندیدگی کے دھار میں رہوں۔“

”ہوں۔“

اریبہ نے ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر شادی ایک ضروری فعل بھی تو ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ ہی رشتہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ تم اکیلی ہو تمہارے لیے کون سوچے گا؟ باہر والوں کی ڈیمانڈ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ تم بھی جانتی ہوں۔“ ناصحانہ انداز میں سمجھایا۔

”ہاں..... مگر ہمیں بہترین کی امید تو رکھنا چاہیے۔“

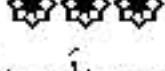
میرے خاندان والے اپنے لڑکوں کو مجھ سے میرے سائے سے دور رکھتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کی سطح بھیگنے لگی۔ یاد ماضی کی لہروں میں اتر گئی۔

”اور پھوپھو مجھے مار ہی ڈالیں گی۔“ آنکھیں جھپکیں۔ ”اور اس بندھن سے بہتر ہے کہ میں ساری عمر بغیر شادی کے رہ لوں۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں انہیں دیکھا جو احساس ہمدردی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اور ساتھ ہی وہ اپنا بیگ تھام کر کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے اجازت دیں آنٹی۔“ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اچانک ہی اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہنے لگا۔ اس کی ذات کتنی بے مایا تھی۔

آنکھوں کے آگے گہری دھند تھی۔



”توقیر! افراسیاب کی مثال تمہارے سامنے ہے اور مجھ میں اور حوصلہ نہیں ہے رسوائی برداشت کر سکوں۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے اور تمہارے لیے خاندان میں بہت سی لڑکیاں ہیں۔ صائمیں فرح بہت اچھی ہیں مجھ سے بیوہ..... یہ گھر مت چھینو..... میں ہوٹل میں نہیں رہ سکتی۔“

”اریبہ! میری ہمت پر بھروسہ نہیں؟“

”ہے..... مگر مجھے کانڈی سائنس اور شیشے کا گھر نہیں چاہیے۔“ رخ پھیر لیا۔

”اور یوں سر راہ اگر گھر کے کسی فرد نے تمہیں میرے ساتھ کچھ لیا تو اور کہانیاں بنیں گی..... پلیز آئندہ میرے راستے میں مت آنا۔“

”اریبہ! بعد میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”نہیں توقیر! بعد میں کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔ بس بگڑنا چلا جاتا ہے۔ بھلا بد دعاؤں کو کبھی کبھی راستے ملا کرتے ہیں۔“ سر جھٹکا۔ ”تم ایک دفعہ پھوپھو کے سامنے یہ بات کہہ کر خود دیکھو تمہارے سارے خواب ہر ن ہو جائیں گے۔“ سر گھما کر اسے دیکھا۔ جس میں اس کی محبت ہلکورے لے رہی تھی۔

”اریبہ! میرا ساتھ دینے کا وعدہ تو کر لو۔“

”نہیں۔“ اس نے مضبوطی سے کہا اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ رورو کر اس کی آنکھیں سوچ گئی تھیں۔ اس نے کمرے کی لائٹ بھی نہیں جلائی تھی۔ اس کے کمرے میں ساون اتر آیا تھا۔ آج پھوپھو نے اسے بے نقطہ سنائی تھیں۔ جانے کیا کچھ نا کہا تھا۔ افراسیاب کی مثال دی تھی۔ طعنے، تشغیر غرض کیا کچھ نہیں اور یہ الزام ہی اس پر سوہان روح بن گیا تھا۔ کہ اسے اچھے لڑکوں کو چلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔

انہوں نے کچھ خیال نہیں کیا کہ اریبہ ان کے بھائی کی بیٹی بھی تو ہے۔ ان کا خون بھی تو ہے۔ اکیلی تنہا لڑکی کے بارے میں کون سوچے گا؟ جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی تھیں اور اس کی آنکھیں جب سے ساون بھادوں تھیں انہوں کے اس ظلم پر.....

اور مظلوم کا ہر آنسو ظالم کے لیے بد دعا بن کر اس کی آنکھ سے ٹپکتا ہے۔

مگر وہ اتنی بد لحاظ نہیں تھی کسی کے لیے بد دعا نہیں بن سکتی تھی۔

مگر خدا کا انصاف سب کے لیے ہے۔ اس کی بے آواز لاٹھی سے تمام حساب برابر ہو جاتے ہیں..... بات صرف صبر و استقامت کی ہے۔

اگلے کئی دن تک وہ کمرے سے نکل نہ سکی توقیر نے اسے کس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

چچی، بڑی آپلی، صائمیں سب نے ہی اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کہا اور تو اور نائی امی بھی حسبِ توفیق اپنا کردار ادا کر گئیں اور وہ سر جھکائے اپنا جرم منہی رہی۔ وہ جرم جو



اس سے سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔

تو قیر ہانگ دہل آیا۔ معذرت کی دلیلیں صفائیاں وہ چپ کر کے اسے دیکھتی رہی۔ بولنا تو اسے کبھی بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا اتر ہوا چہرہ، متورم آنکھیں، ان میں موجود سرخی..... تو قیر شرمندہ ہوتا رہا..... اس کی چپ نے اسے ہرا دیا۔

زندگی کے روکھے پھیکے تمام تر معمولات پھر سے شروع ہو گئے۔

انہی دنوں غری نے بتایا کہ تو قیر بھائی کی منگنی رمضہ سے ہو رہی ہے۔ اس نے شکر ادا کیا۔

”مگر تو قیر بھائی نے ہنگامہ کیا ہوا ہے کہ بس شادی اریبہ سے ہی کرنی ہے۔“ اریبہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

”تو قیر بھائی بھی بس ناں۔“ وہ اپنی دھن میں تھی۔

”ان کے گھر میں روز لڑائیاں ہوتی ہیں مگر پھوپھو کی ناں ہاں میں نہیں بدل سکتی۔“

”اے سمجھاؤ فری! میرا اس معاملے سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ میری زندگی اجیرن نہ کرے۔ اگر اس کی ضد سے تنگ آ کر پھوپھو مان بھی جاتی ہیں تو..... میں..... میں نہیں مانوں گی۔“ سنجیدگی سے اسے دیکھا اور اٹھ گئی۔

”مجھے شیشے کا گھر نہیں چاہیے۔“

اور پھر اچانک ہی ایک ایکسیڈنٹ نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ تو قیر لڑ جھکڑ کر گھر سے نکلا۔ بایک کوفل رفتار میں چھوڑ دیا اور پیچھے سے ٹرک نے لکڑ مار دی۔

اس ایکسیڈنٹ نے اسے ہمیشہ کے لیے معذور کر دیا۔ ایک ٹانگ سے۔ پھوپھو نے اسے جو بددعائیں اور کوسنے دیے۔ الامان والحفیظ.....

گھر آ کر اسے بالوں سے پکڑ کر مارا۔

”کھاگئی میرے بچے کو۔ میں تیزاب سے اس کا چہرہ جلا دوں گی۔ کیا تھا اس بھتی میں اسے میرا ہی بیٹا نظر آیا۔“ اف.....

وہ سر جھکائے سستی رہی۔

الزامات بہتان طعنے..... اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے ہر سواک سنا اک کر بناک آہ پکار ٹھہر گئی۔

جاتے ہوئے وہ کہہ رہی تھیں۔ ”اسے نکال باہر کریں بھائی۔ یہ حرام خور یہاں بھی نمک حرامی کرے گی۔ اپنے بچوں کو اس سے بچا کر رکھیں۔ کماؤ لڑکوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ڈائن..... چٹیل.....“

اس کا خون رکوں میں جم گیا۔

کاش زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

زندگی کس قدر تنگ ہو گئی تھی اس پر.....

اپنوں کے دل تنگ ہو جائیں تو زندگی بھی منہ پھیر لیتی ہے۔

کاش..... کاش..... وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔

اس کا ایم اے مکمل ہوا۔

اس نے کالج میں جاب کر لی۔

بیگم گیلانی کا ساتھ رہا۔ انہیں اس کی ضرورت تھی اور دل کی کٹھا اس کے لیے اسے بھی ایک کندھا چاہیے تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے مونس و غم خوار تھے۔

تو قیر کا اسے بھی دکھ تھا۔ وہ بیساکھی کے سہارے تھا۔ ابھی اس کی ٹانگ میں راڈ ڈلی ہوئی تھی۔

پھوپھو منہ پھر پھر کر اسے بددعائیں دیتی تھیں۔ اس کی وجہ سے ان کا بیٹا معذور ہوا تھا۔ اب ساری عمر وہ اپنے پیروں پر چل نہیں سکتا تھا۔

پھوپھو کی غیر موجودگی میں ایک بار ملنے لگی تھی تو تو قیر کی آنکھوں میں محبت کا عکس اودے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

”بے رحم لڑکی! آگئیں تم.....“

”تو قیر!“ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”یہ..... یہ سب.....“

”تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں۔“

اتنے بڑے حادثے کے بعد اس کے دل میں محبت سلامت تھی۔ وہ رو دی۔

”اریبہ! پاگل لڑکی میری محبت تھام لو تمہیں منزل مل جائے گی اور مجھے کنارہ.....“ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود.....“ بھیگی پلکوں کو چھوا.....

”ٹرک ٹانگ سے لکڑ لایا تھا دل پر تو نہیں..... جذبے سلامت رہیں تو محبت زندہ ہے۔“ وہ شوخ ہو رہا تھا۔

”میں چلوں.....“ ہزبڑا کر اٹھ گئی۔

”امی کو بھیجوں۔“ پیچھے سے پکارا۔

”جانتے نہیں انہوں نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔“ وہ پلٹی۔

”اب نہیں کریں گی۔“ ڈوق بھرے انداز میں کہا۔

اور ایک خالی سی نظر اس پر ڈال کر پلٹ گئی۔

اور یہ سننا ہی سوا بان روح تھا کہ ڈاکٹروں نے تو قیر کو جواب دے دیا ہے کہ اس کا آپریشن ناکام رہا ہے۔ وہ ساری عمر چل نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے چند ماہ بعد اس کی ٹانگ کاٹنی پڑ جائے۔

”ہائے۔“ اس نے دل پکڑ لیا۔

”بہت برا ہوا تو قیر بھائی کے ساتھ۔“ فری رو رہی تھی۔ ”رمضہ کے گھر والوں نے منگنی تو زدی کہ ہم معذور سے کیسے اپنی بیٹی بیاہ دیں۔“

پھوپھو اسے دامن پھیلا پھیلا کر کوسنے دیتی تھیں۔

انہی دنوں خزاں رسیدگی اپنے عروج پر تھی۔ اس کے وجود میں سناٹوں کا راج تھا تو قیر کی معذوری کا دکھ اسے بھی زلزلہ رہا تھا کہ اس کے لیے ایک پر پوزل آگیا۔ بیگم گیلانی کے جاننے والے تھے۔ لڑکا ڈاکٹر تھا۔ اس نے اریبہ کو ان کے گھر دیکھ کر اپنا پر پوزل بھیجا تھا۔

اتنا اچھا رشتہ بچی کی نانی کی اور پھوپھو کی آنکھیں کھلی کیا بھٹی کی بھٹی رہ گئیں۔ حسد و جلن کی آگ نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

”نہیں میرا بیٹا معذور اور یہ ایک خوش کو اور اور مکمل زندگی گزارے۔ بالکل میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔“ اب انہوں نے ایک کمینی نگاہ اپنی دونوں بھواجوں پر ڈالی۔

”اب یہ ساری عمر میرے معذور بیٹے کے ساتھ گزارہ کرے گی۔ اب اس کا نکاح تو قیر سے ہوگا۔ میرے بچے کی نوکرانی بن کر رہے گی۔“

وہ جنونی انداز میں کہہ رہی تھیں اور دونوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”اور اگر یہ انکار کرے گی تو میں اس کے قصے ہر جگہ مشہور کروں گی۔ اس کو خوشحال نہیں رہنے دوں گی۔ اب یہ ہی بھگتے گی۔ ساری عمر۔“ ان کا انداز جنونی ہو رہا تھا۔

اور اس نے سنا تو ساکت ہی تو رہ گئی۔ اس ظلم و زیادتی پر۔ اس بے قصور سزا پر..... مگر اس کی کون سنتا؟

اس شام آنا فانا اس کا نکاح تو قیر سے ہو گیا۔ اس کی سننے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔

سفید کرتے شلو اور میں ملبوس تو قیر بیساکھیوں پر آیا تھا اور میلے کپیلے مٹا لے اور تلخے کپڑوں میں اس کی رخصتی بھی ہو گئی۔

نہ ہاتھوں پر مہندی نہ پھول نہ خوشبو نہ عروسی پیرہن کس جرم کی سزا..... کس خطا کی جزا تھی۔

اگر ایسا ہی ہونا تھا تو..... تو اس کی آنکھ پھرا آئی۔

پھوپھو کی بیٹی تو تھی نہیں کوئی جو بیٹی کا درد جاگتا۔ تین بیٹے تھے۔

”تو نے میرے بیٹے کی صحت، سکھ آرام چھینا ہے۔ میں تجھ سے تیری خوشیاں چھین لوں گی۔ اب ساری عمر تو میرے لپانچ بیٹے کے ساتھ رہے گی۔ اس کی خدمت اس کی غلامی کرے گی اور زندگی کی سرتوں سے دور رہے گی۔“

منہ دکھائی کے طور پر پھوپھو اسے نعرہ دے کر کانوں میں زہر اندل رہی تھیں اور وہ ساکت بیٹھی اس درد کو وجود کی زمین میں اتارنا محسوس کر رہی تھی۔ اپنوں نے کیسا درد دیا تھا؟ کیسے اس کے وجود کو دکھوں کی سنگلاخ زمین پر گھسیٹ کر روند اٹھا۔ یہ..... بھی نہ سوچا کہ ان کے بھائی کی بیٹی تھی۔ ان کا خون مگر نہیں انتقام جنوں نے خون ہی سفید کر دیا تھا۔

بے جرم بے خطا ہی ایک مقتل سے دوسرے مقتل تک کا سفر طے کر لیا۔

اس کے نصیب میں کاغذی گھر اور شیشے کا سائبان لکھا گیا تھا۔ اس کا انکار بے جواز تھا..... وہ صوفے کی پشت سے ٹپک لگا کر ڈھسے گئی۔

زندگی ایک مسلسل درد کی طرح اسے ملی تھی۔

شکوہ شکایت ماحرف دعا..... چہا ر جانب نگاہ کی۔

ایک عرصے بعد اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا مگر کس طرح۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو زندگی میں محتاط رویہ ہی اختیار کیے رہی اور یہ احتیاط زندگی کے لیے سزا بن گئی۔

”یا اللہ.....“ آنکھیں بھیگ گئیں۔

میں تو آپ کی باندی لازمہ نوکرانی بھی بننے کے لیے تیار تھی مجھے..... مجھے محبت بھیک کی شکل میں دے دیتیں۔ اب..... اب اس صورت حال میں گھٹے موڈ کران کے گرد بازو لپیٹے اور ان پر سر جھکا لیا۔ دوسرے لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اشک مسلسل اسے بھگور رہے تھے۔ اماوس کی سیاہ رات اس کے گرد پھیلتی چلی گئی تھی۔ گھور اندھیرا تھا، مہیب سناٹا تھا۔ اس کا خالی وجود تھا اور اشک رواں کی بنا تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب سسکیاں تھمتی تھیں۔ نیند آنکھوں سے دور تھی اور..... سوچوں کا اژدھام تھا جب آہٹ پر وہ چونکی اور ڈر کر سر اٹھایا۔ سامنے تو قیر تھا۔ اسی سفید شلو اور کرتے میں۔ ویل چیز پر آنکھوں میں جاندار سی چمک لیے..... دھیرے سے ڈھلکا ہوا آنکھل سمیٹا اور سیدھی ہو گئی۔

”ہرٹ ہوئی ہو..... اداس و پریشان ہو ایک معذور کے ساتھ زندگی کیسے بسر کروں گی؟“



اریبہ کی سرخ نگاہیں اس پر ٹھہر گئیں۔

”نہیں..... اپنوں کی محبت کے ساتھ اپنوں کے دکھ بھی قبول ہیں مگر پھوپھا کا رویہ ان کا رد عمل ان کی نفرت۔“ آنسو پھر سے بہہ نکلے۔

”وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے ان کے سامنے ان کا جواں بیٹا معذور ہے جو تمہارے ہجر کے خیال سے پاگل ہو رہا تھا۔“ اور لمحہ بھر کو روک کر مسکرایا۔

”اور تمہارے وجود نے جسے نئی زندگی دے دی ہے۔“

اریبہ اسے دیکھ گئی۔

”تمہیں خوشی نہیں ہوئی..... آج تمہاری شادی ہوئی ہے میرے ساتھ۔“

”شادی۔“ سر جھکا کر بغیر وحالی وجود کو دیکھا۔ ”نہ سہاگ کا جوڑا نہ خوشبو عطر نہ چوڑیوں کی کھن کھن نہ پائل کا شور نہ سہاگ گیت اور نہ ہی مسکراتی سرکوشیاں۔“

”یہ شادی تھی یا موت۔“

”کیا ماں باپ کے ساتھ اپنوں کی محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔“ ڈبڈباتی آنکھوں سے اسے دیکھا..... تو قیر کا دل دکھ سے بھر گیا۔ امی کی زیادتی پر..... دھیرے سے ویل چیز آگے کر کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں کہیں کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دوں گا۔ بس ذرا..... دھیرے سے ہاتھ دبایا اور مسکرایا۔

اریبہ اس کی ہمت و حوصلے پر اسے دیکھ گئے۔

”اتنے غور سے مت دیکھو کہ.....“ ذمہ داری انداز میں مسکرایا۔

اریبہ نے سر جھکا لیا۔

”آؤ اپنے کمرے میں چلیں۔“ اور وہ جزیر ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”آؤ۔“ تو قیر نے ہاتھ بڑھایا۔ ”ہمارے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ یہ کام ہمیں خود ہی کرنا ہوگا۔“ وہ صوفے سے نیچے اتری اور تو قیر نے اپنی ویل چیز آگے بڑھائی تو اریبہ نے اس کی بیک تھام لی۔

دھیرے دھیرے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ پھولوں کی خوشبو نے ان کا استقبال کیا۔ بیڈ پر ڈریسنگ ٹیبل پر سائینڈ ٹیبل پر پھول ہی پھول تھے۔ محبت کا یہ بھی انداز تھا۔ اتنی ہمت و حوصلے پر آکھ بھرائی۔

”سنو.....“ ہاتھ تھام کر آگے کیا۔ ”جاؤ وہ سامنے ڈریسنگ روم مجھ روم ہے۔ جا کر شاور لے لو اور خود پر سے اداسی کا آنسوؤں کا ڈلگیری کا لباس اتار کر ادھر بھا دینا اور اندر جو ڈریس ہے وہ پہن کر تیار ہو کر آؤ۔“ ایک بھر پور نظر اس کے ملول وجود پر ڈالی۔

”آخر تم دلہن ہو اور میں دلہا اور ہماری ہب زفاف۔“ اس کے ہاتھ کو دھیرے سے دبایا۔

”معذور ہوں تو کیا ہو حسب توفیق تمہیں تمہاری شان کے مطابق گفٹ تو دے سکتا ہوں۔ وہ..... کیا کہتے ہیں اسے.....“ پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ”رو نمائی۔“ چمک دار آنکھوں سے دیکھا اریبہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

اس کی آنکھوں میں احساس محرومی کا احساس نہیں تھا۔ معذوری کا دکھ نہیں تھا اسے پالینے کا شمار تھا لو دیتی محبت تھی۔

”جاؤ۔“ ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”ایسا نہ ہو کہ.....“ ہونٹ دبا کر ہنسا۔

وہ بھی گھبرا کر پلٹ گئی اور ڈریسنگ روم کا دروازہ بند کر لیا۔

سامنے ہی سی گرین اور بلو امتزاج کا شرارہ ہنگ ہوا تھا۔

تو قیر کی اس دریا دلی پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کی محرومی معذوری پر دل بھر بھر آ رہا تھا کیسا سچا اور محبتوں بھر شخص معذور ہوا تھا مگر ہمت اور ضبط قیامت کا تھا۔

دھیرے سے چہرہ صاف کیا۔

”اریبہ تمہیں بھی اس شخص کے سامنے اتنی ہی ہمت اور حوصلہ کرنا ہے اسے کبھی محرومی اور احساس کمتری کا احساس نہیں دلانا۔ اس کی محبتوں کو اب تسلیم کر کے محبت ہی دینی ہے۔“ کیونکہ چاروں طرف سامنے قد آور شیشے میں اس کا ملگجا پھیکا روپ نمایاں تھا۔

”اب تمہارا یہ ہی گھر ہے۔ تحفظ گاہ ہے آسرا ہے سائبان ہے۔“ ہاتھ روم کا دروازہ کھولا۔

شیشے کا ہی سیسی کاغذی ہی سیسی اب..... دھیرے سے ہاتھ روم میں داخل ہو گئی۔

اب تا عمر اس دیا رہیں رہنا ہے۔

اریبہ کتنی دیر سے تیار کھڑی تھی۔ شاور لے کر بال سکھا کر اس نے وہ لباس پہن لیا تھا۔ قد آور شیشے کے آگے رکھا وہ میچنگ سیٹ اور چوڑیاں بھی پہن لی تھیں۔ نازک سی بندیا کو ماتھے پر سیٹ کر لیا تھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ بھی جمایا تھا تو قیر نے جانے یہ سب کیسے خرید ا ہوگا..... اس کی محبت میں۔ پھوپھا کو تو خیال ہی نہیں تھا۔ انہوں نے انتظام ساری کارروائی کی تھی۔

اس مضبوط چھت کو دل سے قبول کر لیا تھا تو ان سب چیزوں کو استعمال کرنا ہی تھا۔

قد آور سائینڈ مر اسے رنجور اداس اور مخموم دلہن کہہ رہا تھا۔ کب سے تیار تھی مگر باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

کون اسے تھام کر باہر لے جاتا۔

”اریبہ!“ دھیرے سے تو قیر کی آواز آئی۔

ہمت کر کے دروازہ کھول دیا۔

”واہ۔“ ستائشی نگاہ نے تجل سا کر دیا۔

”آؤ۔“ محبت آمیز انداز میں پکارا۔ کب ایسا سنگھار کیا تھا۔ شرم سے زمین میں گڑ رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہے تم دلہن ہو اور چل نہیں سکیں.....“ اس نے ناگوں پر پڑی چادر ہٹا دی۔ ”اور دلہن جب تک نہیں چلتی جب تک انہیں سہارا نہ ملے۔“

دوسرے لمحے وہ کھڑا ہوا۔ قانچیں بھر کر اس کے پہلو میں آیا۔ اس سے پہلے ہکا بکا اریبہ دم بخود ہو کر لہرائی۔ بازو پھیلا کر تو قیر نے اسے تھام کر سہارا دیا۔ ایک ہاتھ تھام کر بیڈ پر گاؤں کیوں کے مقابل بٹھایا۔

وہ عالم خیر سے اسے دیکھ جا رہی تھی۔

”تم..... تم۔“

”ہاں! جان تو قیر میں تو قیر ہمدانی بالکل ٹھیک صحت مند صحیح سالم آپ کے حضور رونمائی پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔“ اس کی حیرت کا مزہ لیتے ہوئے اس کی ہتھیلی تھام کر رنگ پہنائی۔

”تو وہ..... سب۔“ وہ ہکلائی۔

”وہ سب ایک ڈرامہ تھا۔ تمہیں پانے کا‘ محبت کو وصل بنانے کا۔“ دھیرے سے اس کے زانو پر سر رکھ کر لیتا۔

”اور یہ نہ کرنا تو پھر کیا کرنا۔ امی تو کسی طور راضی نہ تھیں۔ تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اتنی محبت تھی تم سے مگر تم نے پذیرائی نہیں کی۔ اب تو کروگی نا؟“ کلائی میں پڑی چوڑیاں بجاتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔

ایک ٹک اسے دیکھ جا رہی تھی۔

”ایک سیڈنٹ بھی ٹھیک تھا‘ زنی ناگ بھی ٹھیک تھی ناگ میں راڈ ڈالی ہے۔ یہ ڈرامہ تھا۔ پلاننگ تھی۔ امی نے کبھی راضی نہیں ہونا تھا کیونکہ تم ان کے لیے امیر بہو نہیں تھیں اور تمہیں اب ان کی نظروں میں سرخرو بھی کرنا ہے۔“

تو قیر دھیرے سے کہہ رہا تھا۔

اور اریبہ دم بخود تھی۔ اتنی محبت اتنی چاہت.....

”میں صبح امی کو بتاؤں گا کہ ہم لوگ اگلے ہفتے علاج کے لیے باہر جا رہے ہیں اور علاج کے لیے پیسہ روپیہ دیں۔“ جو کہ ماموں نے اس کے لیے ڈپازٹ کروایا ہوا تھا تا کہ اس کی شادی اور تعلیم پر خرچ ہو۔ اس کا علم صرف اریبہ کو تھا چونکہ رقم ایک مدت کے لیے تھی اس لیے نکل نہیں سکتی تھی۔

”لیکن..... میرے پاس پیسہ تو.....“

”ہے..... میرے پاس ہے۔ اتنا ہے کہ اگلے ہفتے ہم نئی مومن کے لیے روانہ ہو سکیں۔ علاج کے نام پر واپس آئیں گے سب ٹھیک ہوگا۔“

”ایسے.....“ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

”جیسے کل صبح امی تمہیں محبت سے گلے لگائیں گی‘ معذرتیں اور دیلیں دیں گی۔“

”کیوں.....؟“ وہ سمجھی نہیں پھوپھا کیوں کریں گی۔

”بھئی تم ان کے معذور بیٹے کا علاج جو کرواؤ گی۔“ شرارتی نگاہ اس پر مرکوز تھی اور اس نے گہری سانس لی۔

ساری بات ساری پلاننگ سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس پر دکھوں کے سایہ نگن بادلوں کو رنجور ہوائیں ایک دم سے اڑا لے گئیں۔ اس کا وجود ہلکا پھلکا ہو گیا۔ سر جھکا کر تو قیر کو دیکھا جو اہلاناہ انداز میں ٹار ہو جانے والی نظروں سے اسے سلام محبت دے رہا تھا۔

حیا کی اک لہر نے اسے بھی جھگودیا۔

محبت کا سچا خلوص اور سچائی‘ جان گئی تھی اس لیے شرعی باتوں کے ساتھ پذیرائی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ دھیرے سے ہتائی ہاتھوں سے تو قیر کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر دلکش انداز میں مسکرا دی۔